حالی کے دو اہم مرثیے

تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

ایم حسن نوشاہی

ABSTRACT:

Moulana Hali,s elegies are swarmmed with best literary traits. His poetry expresses the real spirt of literature.He gives the obligatory precedents along with the literary taste.He deduces the pathoes of heart in such a way that the actual era of his own comes before our eyes.His elegic poetry brought a revoulution with respect to islamic thought.Great specimens of his elegic poetry are Ghalib,s elegry and Hakim Mehmod Khan,s elegry.In these elegies, we find the past era as well as the deep interpretation of meanings in a delibrate manner. Hali,s elegies are the trumas which are the effects of his creative power .Here his pathoes is not his own enigma but it comes the national pathoes collectively.

مرثیہ عربی زبان کے لفظ ’’ رثی ‘‘ سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی رونا دھونا اور آہ وزاری کرنا کے ہیں ۔اصلاح شعر میں مرثیہ اس صنف سخن کو کہا جاتا ہے جس میں کسی متوفی کے حسنات وخصائل غم انگیزی کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں ۔گویا غم اور جدائی کے جذبات تخلیقی تجربے میں ڈھل کر مرثیہ کی بنیاد بنتے ہیں ۔غم ہی وہ جذبہ ہے جو اپنی شدت کی ہمہ گیری کے اعتبار سے ہر جذبے سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔یہ رگوں میں گردش کرتا اور سانسوں میں سماتا چلا جاتا ہے۔موت کی دائمی جدائی کا غم یقیناً شدید تر رثائی جذبات کو ابھارتا ہے۔ ابتدائی طور پر عربی شاعری میں اس صنف کا رواج نظر آتا ہے اس زبان میں مرثیہ گوئی اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود شاعری۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پہلا مرثیہ ہابیل کے قتل پر حضرت آدم نے کہا تھا۔قدیم عربی ادب میں مہلہل بن ربیعہ،ابن الزیات اور حضرت عبدالمطلب کے مرثیے آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں ۔ان مرثیوں میں شعرا اپنے ممدوحین کے صبر و استقلال ،عزم و ہمت ،جرات وشجاعت اور قوم وملت کے لیے ان کی خدمات بیان کرتے ہوئے ان کی اموات کو صدمہ ءِ جانکاہ قرار دیتے تھے ۔حضور ﷺ کے وصال پر حضرت حسان بن ثابت نے سوز و گداز سے معمور رقت انگیز مرثیہ

لکھا۔غرضیکہ ہر دور میں شعرائے کرام نے اپنی محبوب شخصیات کی وفات پر اعلیٰ پائے کے مرثیے کہے ہیں۔عربی کے زیر اثر ترکی، فارسی اور اردو زبانوں میں مرثیہ کا آغاز ہوا۔فارسی زبان میں رودکی نے اپنے معاصر شاعر ابوالحسن شہید بلخی کا مرثیہ لکھا۔مسعود سعد سلمان نے اپنے بیٹے صالح کی موت پر مرثیہ لکھا۔اسی طرح فردوسی نے اپنے بیٹے کی ناگہانی موت پر مرثیہ کہا۔سقوط بغداد کے موضوع پر شیخ سعدی نے مرثیہ لکھا۔ایران میں شاہ اسماعیل صفوی کے دور میں مرثیہ کو صرف سانحہ کربلا کے پرسوز واقعات کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ہندوستان میں آنے والے مرثیہ نگار فارسی شعرا میں نظیری نیشاپوری اور عرفی شیرازی قابل ذکر ہیں جو ایران سے آکر اکبر کے دربار سے منسلک ہوئے۔ان فارسی شعرا کے اسلوب پر عربی مراثی کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔انہی شعرا سے ہندوستان کے تخلیق کار مرثیہ لکھنے کی تحریک حاصل کرتے ہیں۔

اردو ادب میں مرثیہ گوئی کا آغاز حیدرآباد دکن سے ہوا۔وجہی ،غواصی ،نصرتی ،ہاشمی،کاظم ،افضل اور قاضی محمود بحری کے مرثیوں نے اس صنف سخن کو جلا بخشی۔شاہانِ گولکنڈہ اور بیجا پور چونکہ خود بھی سخن فہم اور ادب شناس تھے اس لیے انہوں نے اس صنف کو مذہبی عقیدت سے پروان چڑھایا اور خود اس کی سرپرستی کی۔ولی ،سودا اور میر جیسے شعرا نے اس صنف کو توشہ آخرت سمجھتے ہوئے کئی مراثی تخلیق کیے۔غمگین،حزین اور مسکین جیسے دہلوی شعرا نے مرثیہ میں بہت نام پیدا کیا۔انیس اور دبیر کی مرثیہ نگاری نے فنی اور فکری طور پر اس صنف سخن کو بام عروج تک پہنچا دیا۔اردو میں فارسی کے زیر اثر مرثیہ کا اطلاق بالعموم حضرت امام حسین اور ان کے رفقا کی شہادت پر ہی ہوتا ہے لیکن اردو میں واقعہ کربلا سے ہٹ کر شخصی و قومی مرثیے بھی لکھے گئے ہیں۔جن میں قوموں کے عروج و زوال، دنیا کی بے ثباتی، اخلاقی و علمی انحطاط پر حزن و ملال کی دردانگیز تصویر کشی کی گئی ہے۔مثلاً دہلی کی بربادی پر میر کا قطعہ اور سودا کا شہرآشوب اور اسی موضوع پر بہادر شاہ ظفر کا لکھا ہوا مرثیہ جس میں وہ اپنی اداسی کا اظہار وہ ان لفظوں میں کر رہے ہیں۔کہ ''جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھر، یاں تھے'' اسی طرح ''کبھی محو تماشا دیدہء اہل نظر، یاں تھے''۔غالب کا تحریر کردہ عارف کا مرثیہ بھی ذاتی غم و اندوہ کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔مولانا حالی کے مرثیے اسی روایت کا نتیجہ تھے۔ان کی ساری شاعری نوائے جگر سوز تھی جس نے ملت اسلامیہ کے خزاں رسیدہ چمن کو بہار آشنا کرنے کی کوشش کی۔

مولانا حالی نے انہی لوگوں کے مرثیے لکھے ہیں جنہوں نے زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ میں قوم کی خدمت کی ہے اور جو قوم کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے تھے۔حالی کے شخصی مرثیوں میں مرثیہ غالب ،مرثیہ خواجہ امداد حسین ،مرثیہ حکیم محمود خاں دہلوی ،مرثیہ نواب محسن الملک ،سرسید احمد خاں کا مرثیہ،خان بہادر برکت علی خان ،میر تراب علی خان وغیرہ کے مرثیے شامل ہیں۔قومی و اخلاقی نقطہءِ نظر سے غالب اور حکیم محمود خاں کے مرثیے لاجواب ہیں--یہ مرثیے اپنے فنی و فکری خصائص سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس صنف کی حدوں کو وسیع کیا جاسکتا ہے اور اسے صرف رونے رلانے کے سامان کے بجائے تاریخی، سماجی اور تہذیبی اظہار کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔اس میں شہدائے کربلا کے ساتھ ساتھ قومی شخصیات ،قوم کی تباہی ،تہذیب و تمدن کی بربادی اور سماج کے عروج و زوال کی داستان بھی نظم کی

جاسکتی ہے۔لہذا ایک فرد کے بجائے ایک قوم یا ایک دور کا مرثیہ بھی لکھا جاسکتا ہے۔آنے والے دور کے شعرا نے حالی کی اس آواز کے اثرات کو شدت سے محسوس کیا ہے۔حالی کے ان مرثیوں میں قومیت و دلسوزی کی روح نظر آتی ہے۔ ان کے مراثی صرف ذاتی دکھ درد یا ان کے مرحوم دوستوں کی ذات وصفات کا بیان ہی نہیں بلکہ ایک دور کے تہذیبی مدوجزر کے آئینہ دار بھی ہیں۔وہ خود لکھتے ہیں۔

> فی الواقعہ کسی شخص کی شکر گزاری اور احسان مندی کے اظہار کا موقع اس سے بہتر نہیں ہوسکتا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی وفات پر افسوس کیا جائے اور اس کا ذکر جمیل ملک میں پھیلا دیا جائے۔(۱)

حالی کا دور سامراجی استحصال کا دور تھا۔مسلمانوں کی سیاسی،تعلیمی،معاشی اور معاشرتی حالات انتہائی پسماندہ ہوچکی تھی۔اسلامی تہذیب وتمدن پر انگریزی تہذیب غلبہ پارہی تھی اور مسلمان اپنی روایات سے دور ہورہے تھے۔اخلاقی اقدار قصہ پارینہ بنتی جارہی تھیں۔فرائض سے غفلت وتیرہ بن گئی۔ذاتی مفاد اور خودغرضی قومی وملکی مفاد پر غالب آگئی۔یہ سیاسی وسماجی حالات ہی ہوتے ہیں جو فکروفن کو نئے سانچوں میں ڈھال دیتے ہیں۔انہی حالات میں قوم کا درد رکھنے والے شعرااور ذہنی اور فکری معمار، اصلاح فکرو معاشرت کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں اور قومی تربیت کے لیے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہیں۔وہ قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم وفنون کے حاصل کرنے پر زور دیتے ہیں۔ان تہذیبی و سیاسی حالات نے دوسری اصناف ادب کے ساتھ ساتھ اردو مرثیے کو بھی وسعت دی اور یہ اپنے موضوع کی روایتی حدود کو پار کر کے زندگی کی سرحدوں سے جالگا۔اب اس کا مقصد محض آہ و بکا نہ رہا کہیں اس میں فلسفہ زندگی پر بحث کی جانے لگی اور کہیں فلسفہ اخلاق کا درس دیا جانے لگا۔مرقع نویسی،منظر آرائی اور انسانی جذبات کی تصویر کشی مختلف پہلوؤں سے سامنے آنے لگی۔یہ زندگی کی تہذیب کرنے لگا اور اس کے کردار عام زندگی میں گھلنے ملنے لگے۔یوں اس کی معنوی حیثیت اور ابھر کر سامنے آگئی۔تخلیقی سطح پر شہادت حسین سے حاصل ہونے والے استعارے ظلم و جبر اور آمریت کے خلاف صدائے احتجاج کے طور پر استعمال ہونے لگے۔اس انداز میں مرثیہ اپنے لغوی مفہوم سے بلند ہوکر عصری شعور کا ترجمان ثابت ہونے لگا۔

حالی کے مرثیے اعلیٰ ادبی صفات سے متصف نظر آتے ہیں۔وہ نہ صرف موضوع کی عظمت اور ندرت تخیل کے اعتبار سے مثالی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ادب میں حسن بیان،طرز ادا،احساس کی رو،اسلوب کی سادگی وسلاست کی بنا پر ادبی اعتبار سے بلند تر منصب پر فائز نظر آتے ہیں۔وہ شعر وادب سے حقیقی زندگی کی ترجمانی کا کام لیتے ہیں اور لطف سخن کے ساتھ اصلاحِ احوال کا سامان بھی فراہم کرتے جاتے ہیں۔ڈاکٹر عبدالقیوم خاں کے بقول''حالی مرثیے کی تہذیبی اور اخلاقی حیثیت پر زور دیتے ہیں؛انہوں نے اسی پر اپنے مراثی کی بنیاد رکھی اور نئی نسل کو بھی یہی مشورہ دیا''۔(۲) حالی کی شاعری سادگی،اصلیت،جوش،حقیقت پسندی،دلنوازی اور دلکشی کا مرقع ہے۔ان کا ادبی ذوق اور فنی پختگی اسلوب کے حسن کو دو چند کردیتی ہے۔وہ قاری کے وجدان وتخیل کو فکر وعمل کی روشنی سے منور کردیتے ہیں۔کیونکہ وہ دل کے کرب کو تخلیقی تجربے میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کا پورا عہد ہمارے سامنے

آ جاتا ہے۔ ان کی رثائی شاعری قومی جمود کے تالاب میں گرنے والا ایسا ڈھیلا ثابت ہوئی کہ جس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی لہریں ،فکری انقلاب پیدا کرنے کا باعث بنیں۔ اقبال کی شاعری اسی فکری ارتقا کا حاصل ہے۔حالی نے جس کام کی بنیاد رکھی ،اقبال نے اسے بلندیوں سے ہمکنار کیا۔اقبال خود حالی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

حالی ز نواہائے جگر سوز نیا سود
تا لالہ ءِ شبنم زدہ را داغ جگر داد

حالی کا مرثیہ غالب مثنوی کی بحر میں دس بندوں پر مشتمل ہے۔مرثیے میں لفظوں کی مرصع سازی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ وہ جذباتی طلسم کاری سے ہر خیال کو حقیقت میں بدل دیتے ہیں ۔یہاں جذبے کی origonality بھی نظر آتی ہے اور غم کا تاثر بھی ۔زندہ اسلوب اسی جذبے کے خلوص اور صداقت سے پہچانا جاتا ہے ۔اس مرثیہ کے آغاز میں وہ دنیا کی بے ثباتی کو فنکارانہ مہارت سے پیش کرتے ہوئے اسکو محض خواب و خیال سے تعبیر کرتے ہیں ۔درد پنہانی کا قصہ طویل ہے جبکہ وقت مختصر ہے۔بحر ہستی سراب ہی سراب ہے ۔بزم سلطانی ہو یا تخت خاقانی ،صرف فریبِ وہم و گمان ہے۔ پوری زندگی کا فلسفہ چند لفظوں میں بیان کر دیا۔

کیا کہوں حال درد پنہانی
وقت کوتاہ و قصہ طولانی
عیش دنیا سے ہو گیا دل سرد
دیکھ کر رنگ عالم فانی
کچھ نہیں جز طلسم خواب خیال
گوشۂ فقر و بزم سلطانی
ہے سراسر فریب وہم و گماں
تاج فغفور و تخت خاقانی
بحر ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

حالی غالب کو ''بلبل ہند'' کہتے ہوئے ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہیں ۔انہیں نکتہ داں ،نکتہ سنج او رنکتہ شناس قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنی شاگردانہ عقیدت کا اظہار بھی کرتے ہیں اور مہربان استاد کی وفات کو روشن چراغ کے بجھ جانے سے تعبیر کرتے ہیں ۔اس بند میں صنعت تکرار اور صنعت تنسیق الصفات زبان و بیان میں حالی کی قدرت کاملہ کی غمازی کرتی ہیں ۔اس بند کا یہ شعر ،ایک روشن دماغ تھا نہ رہا، تو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔حروف کی تکرار شعر میں غنائیت پیدا کر رہی ہے۔ پر تاثیر الفاظ کا استعمال ،موضوع کی معنویت کو وسعت دیتا نظر آتا ہے۔

بلبل ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں ایک بات
نکتہ داں،نکتہ سنج،نکتہ شناس
پاک دل ،پاک ذات ،پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج ،شوخ مزاج
رند اور مرجع ءِ کرام و ثقات
ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

انسان ہمیشہ سے ازلی حسن کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔وہ کبھی روح کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتا ہے اور کبھی فطری اور انسانی مظاہر میں اس حسن کی مماثلت محسوس کرتا ہے۔ غالب کی فنی وفکری عظمت اور نظم ونثر میں کامل قدرت کو حالی اسی حسن بے مثال کی ایک کرن محسوس کرتے ہیں۔لہذا وہ غالب کی نثر کوحسن جمال کا مرقع اور ادب میں ان کی شخصیت کو بے مثال سمجھتے ہیں۔ حالی انہیں فارسی کے معروف شعراء انوری وکمال سے برتر قرار دیتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں یہ لکھتے ہیں کہ آج لوح امکاں سےعلم وفضل وکمال کی صورت مٹ گئی ہے اور ہم آج کے بعد انہیں دیکھ نہیں سکیں گے:

نثر حسن جمال کی صورت
نظم غنج و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر
تعزیت اک ملال کی صورت
قال اس کا وہ آئینہ جس میں
نظر آتی تھی حال کی صورت
چشم دوراں سے آج چھپتی ہے
انوری و کمال کی صورت
لوح امکاں سے آج مٹتی ہے
علم و فضل و کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
غالب بے مثال کی صورت

مرثیے کے الفاظ اتنے قوت آفریں ہیں کہ ان کے باطن سے حیات جاوداں کے چشمے پھوٹتے محسوس ہوتے ہیں جاندار تشبیہات اور فکر انگیز استعارات میں ایک غیر معمولی توانائی اور تاثیر ہے۔جو شخصی اوصاف کو جاندار اور

فعال پیکروں میں تبدیل کر کے پیش کر رہی ہے ۔وہ قوم کے دلوں میں اہل کمال کی محبت اور عظمت کے نقوش کو ابھارنا چاہتے ہیں ۔حالی کا اسلوب سادہ بھی ہے اور پرشکوہ بھی ۔لفظی اور معنوی صنائع کے استعمال نے استعاروں کو فصیح و بلیغ اور گہرا بنادیا ہے۔ان میں موجود جوش اور جذبہ قابل دید ہے ۔شاعر واردات قلبی کو کامل اخلاص سے بیان کر رہا ہے ۔شاعر کی استعمال کردہ تشبیہات اس کے تخیل اور فکرونظر کے رنگوں کو اجاگر کررہی ہیں۔ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول

> استعارہ اور تشبیہ کی جڑیں بھی خیال کی طرح بہت گہری ہیں ۔اس کی شاخیں تجربے اور خیال کے ساتھ ابھرتی ہیں اور بیان کا جزو بن کر باہر آتی ہیں ۔۔۔۔۔یہ ادیب اور شاعر کی فطرت کا ایک وصف ہے جو خیال کے ساتھ خیال کی مصوری کرتا ہوا خارج میں نمودار ہوتا ہے اور ادیب اور شاعر کے ذہن اور فکرونظر کے رنگ اور رجحان کی غمازی کرتا ہے۔(۳)

حالی غالب کوحسن فطرت کی شان اور لفظ آدمیت کا معنی سمجھتے ہیں جو خاکساروں سے تو انکساری سے پیش آتے مگر خود پسندوں کے ساتھ اپنی خودداری اور سر بلندی پر آنچ نہ آنے دیتے۔انھوں نے زہد وتقوی کے بجائے بے ریائی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔حالی نے اپنے تخیل کوشعر کے سانچے میں اس طرح ڈھالا ہے کہ اس کے پیرایۂ بیان سے غالب کی سیرت کے یہ نمایاں نقوش ہمارے کے لیے قابلِ کشش بن جاتے ہیں ۔لفظ ومعنی کی صوتی جھنکار،ان کی تاثیر اور زبان و بیان کے اسلوب نے مصرعوں میں میں تغزل کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔حالی نے اپنی تخلیقی قوت سے غالب اور ان کے مداحین میں ایک جذباتی قرب پیدا کر دیا ہے ۔

خاکساروں سے خاکساری تھی
سر بلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ
دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے
زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب
ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا
مظہر شان حسن فطرت تھا
معنیٔ لفظِ آدمیت تھا

شاعر عالمگیر محبت کا حامل ہوتا ہے ۔وہ مروت ،ایثار ،ہمدردی اور دوستی کا پرچار کرنے والا ہوتا ہے۔خارج کے حالات اس کی داخلیت کو متاثر کرتے ہیں ۔خنجر کسی پہ بھی چلے ،تڑپتا وہ ہے ۔یوں وہ سارے جہاں کے درد کو اپنے جگر میں سمائے ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کا فن پارہ سچائی کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔حالی کے فکروفن

میں انسان دوستی، وسعت قلبی اور اخلاص ہی اخلاص نظر آتا ہے۔اس مرثیے میں وہ کمال بے ساختگی سے اپنی دلسوزی و بے قراری کا اظہار کرتے ہیں وہ نہ صرف غالب سے اپنی والہانہ محبت کا دم بھرتے ہیں بلکہ ان کی شاعرانہ عظمت کو مدلل طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ادبی رنگینی ، بلند پروازی اور نازک خیالی سے گریز کرتے ہوئے ،وہ فطری عناصر کے اظہار کو ترجیح دیتے ہیں۔ان کے جذبِ دروں سے احساسات پگھل پگھل کر شعر کی صورت میں سامنے آرہے ہیں۔سید عابد حسین اپنے مضمون ''حالی'' میں لکھتے ہیں۔''وہ نقش انسانی، عالم معاشرت، عالم فطرت کے حقائق کو ہمدردی کی نظر سے دیکھتا ہے اور دوسروں کو دکھاتا ہے۔دردوسوز اسی کا حصہ ہے اس لیے کہ اسے صرف اپنا ہی غم نہیں سارے جہاں کا غم ہوتا ہے۔''(۴)

حالی نے ان اشعار میں غالب کی تہذیبی اور تمدنی حیثیت کو واضح کیا ہے ۔وہ سب سخنوروں کو غالب نکتہ داں کے مقابلے میں خاک سمجھتے ہیں۔یہ مخلص دوست کی جدائی میں سلگنے کی کیفیت ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہل میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو
سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

حالی کے لفظوں میں غم کی تاثیر بھی ہے اور فکر کی چنگاری بھی جو دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے۔یہاں بے پناہ محبت کے ساتھ ساتھ بے انتہا عقیدت بھی دکھائی دے رہی ہے۔پروفیسر آل احمد سرور کے بقول''حالی خود روتے ہیں اور دوسروں کو رلاتے ہیں، پھر ایسی باتیں کہتے ہیں کہ آنکھوں میں آنسو خشک ہو جاتے ہیں مگر دلوں میں عزم بیدار ہو جاتا ہے''(۵)۔حالی کے کلام کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ ان مصرعوں کو نثر میں تبدیل کرنا چاہیں تو لفظوں کی معمولی تبدیلی سے مصرعے ،فقرات میں ڈھل سکتے ہیں ۔اس صفت کو نظم کا سب سے بڑا کمال قرار دیا جا سکتا ہے۔سخی احمد ہاشمی حالی کے اس مرثیہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ۱۸۶۹ء میں غالب جیسا استاد دنیا سے رخصت ہو گیا اور حالی جیسا شاگرد رو پڑا۔سخن سنج اور سخن فہم کے لیے سخن گو کی روح میں بھی سخن گسترانہ شان ہے ۔سعادت مند شاگرد کی سیدھی سادی بات اور سادہ زبان ہے ۔اس مرثیہ کو مولانا نے ترکیب بند میں لکھا ہے اور متانت اور سنجیدگی کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ۔خود آنسو بہائے ہوں یا نہ بہائے ہوں لیکن دوسروں کو

رلا دیا ہے اور غالب کے غم کو ہر دور میں تازہ کر دیا ہے۔ (۶)

حالی کا دوسرا اہم مرثیہ حکیم محمود خاں دہلوی کا مرثیہ ہے یہ مسدس کی ہیئت میں چھیالیس بندوں پر مشتمل ہے ۔حالی کا یہ مرثیہ صرف ایک شخص کا مرثیہ نہیں بلکہ قومی زوال کا مرثیہ ہے ۔یہ ایک عظیم الشان تہذیب وتمدن کی تباہی کی عبرت ناک داستان ہی نہیں ہے بلکہ امت مسلمہ سے علم و ہنر کے چھن جانے کا نوحہ بھی ہے۔اس مرثیے کے آغاز میں حالی نے دہلی،مسلمانوں کی شوکت رفتہ اور جاہ وجلال کی تصویر کشی بڑے موثر انداز میں کی ہے۔ وہ دہلی کو یونان کے بعد علم وحکمت کی دوسری جنم بھومی قرار دیتے ہیں ۔وہ مسلمانوں کے اجتماعی شعور کو بیدار کرتے ہوئے اس حقیقت کو دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ آج کا مسلمان اپنے اسلاف سے کس قدر مختلف ہے۔وہ دہلی کے ہنر مندوں کو بھی خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور اس سرزمین کو محدث خیز قرار دیتے ہوئے غرناطہ وبغداد کو اس کے مشابہ سمجھتے ہیں ۔حتیٰ کہ وہ یہاں رہنے والے فقہیان اسلام کو اپنے اپنے وقت کے ''بیہقی'' قرار دیتے ہیں ۔آغاز کے دس بند دہلی کے عروج سے متعلق ہیں۔ حالی شاندار ماضی یاد دلا کر نئی نسل میں جمود وقنوطیت کے بجائے حرکت و رجائیت پیدا کرنا چاہتے ہیں

اے جہاں آباد اے اسلام کے دارالعلوم
اے کہ تھی علم وہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنر مند تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم
تھا اضافہ تیرا جاری ہندسے تاشام وروم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

حالی دہلی کے عروج کا نقشہ کھینچنے کے بعد اگلے چھ بندوں میں اس کی زوال پذیری کی منظر کشی کرتے ہوئے نوحہ کناں ہیں ۔وہ اس کے شاندار ماضی اور اس شہر کی عظمت کا حوالہ بننے والے اہل علم و ہنر کو یاد کرتے ہیں ۔وہ لوگ جو اس کے ماتھے کا جھومر اور منبر ومحراب کی زینت تھے،رفتہ رفتہ عدم کو سدھارتے گئے جس کے نتیجے میں میں یہاں پر بپا ہونے والی علمی محافل اپنی جاذبیت کھو بیٹھیں۔اب خانقاہوں اور مدرسوں میں ایسے لگ رہا ہے جیسے اداسی بال کھولے سو رہی ہو۔

ہو گئے تیرے محدث راہیِ دارالسلام
کر گئے دنیا سے رحلت تیرے مفتی اور امام
ہو گیا رخصت جہاں سے تیرا جاہ و احتشام
رفتہ رفتہ ہو ہو گئے سب صاحبی تیرے تمام
مجلسیں برہم ہوئیں زیر و زبر دیواں ہوئے
خانقاہیں بے چراغ اور مدرسے ویراں ہوئے

حالات نے کروٹ بدلی تو سیاسی محکومی اور ذہنی غلامی قوم کا مقدر بن گئی ۔غفلت وسستی قومی شعار بن گئی اور تہذیبی روایات دم توڑنے لگیں۔ایک وقت تھا کہ یہاں پرعلم والے اپنے علم سے لوگوں کومستنیر کرتے تھے اور ان کی علمی پیاس بجھاتے تھے،واعظانِ قوم اپنے وعظ و نصائح سے قوم کو جگانے کا فریضہ ادا کرتے تھے۔اہل سخن ،شعروادب میں اپنی سحر کاریاں دکھایا کرتے تھے۔حالی سلطنت وحکومت کے چھن جانے اورمن حیث القوم اپنی علمی واخلاقی تباہی پرملول اور افسردہ ہیں ۔آج سب کچھ ختم ہو چکا ہے ۔حکیم محمود خاں ،اس زوال پذیر دہلی کی ٹوٹی ہوئی ناؤ کا آخری تختہ تھے ۔وقت کے حوادث نے اس تختے کو بھی آج توڑ دیا۔یہ تختہ بھی اس قومی زوال اورموت کے سیل فنا کے آگے ٹھہر نہ سکا۔

چل دیے نوبت بہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب
مٹ گئی تیری طبابت،چھٹ گئے تیرے طبیب
جاگ جاگ آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب
اس گلستاں سے نہ اٹھی پھر صدائے عندلیب
جن کو کھو بیٹھے، نظیر ان کا کہیں پایا نہ پھر
جو گیا اس کا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر
علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیے
واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیے
کچھ سخنور تھے جو سحر اپنا دکھا کر چل دیے
کچھ مسیحا تھے کہ مردوں کو جلا کر چل دیے
ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گئی سیل فنا اس کو بھی اے دلی بہا

صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں ۔"حکیم محمود خاں کا مرثیہ صرف ان کا مرثیہ نہیں بلکہ دلی کی عظمت اور بزرگی ،اس کے علم اور حکمت کا مرثیہ ہے ۔شاعر دیکھ رہا ہے کہ ایک ایک کر کے صاحبانِ علم وحکمت رخصت ہو رہے ہیں ۔دلی۔۔معدنِ جواہر دلی روز بروز تہی دست ہوتی جا رہی ہے"(۷)۔حالی نے ملت اوراخلاقی اقدار کی زوال پذیری پر یہاں مسدس کے پیرایہ میں خوب اظہار خیال کیا ہے۔اس ہیئت میں مرثیہ لکھنا تخلیقی اظہار کے لیے کوہ گراں کی حیثیت رکھتا ہے ۔جسے وہی کاٹ کرعبور کر سکتے ہیں جومشق سخن کا تیشہ رکھتے ہوں ۔پانچویں اور چھٹے مصرعے کے لیے ایسے لفظوں کو لانا کہ وہ سارے مصرعوں کا حاصل ٹھہریں یقیناً محنت طلب اورمشکل کام ہے۔حالی یہاں اپنے لفظوں زندگی کے رنگ بکھیرتے نظر آتے ہیں ۔لفظوں کی قدر و قیمت ہمیشہ جذبوں کی آنچ کی محتاج ہوتی ہے۔اگر جذبہ خالص ہوتو الفاظ زندگی کے رنگ سے مزین نظر آتے ہیں ۔حالی اپنے جذبے اور احساس کو سادگی سے اشعار میں ڈھال دیتے ہیں اور اسی سادگی سے تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔بیان میں تسلسل اور حکیمانہ خیالات ادا

کرنے کا سلیقہ قابل دید ہے۔ان کے سادہ سے الفاظ جادوئی تاثر لیے ہوتے ہیں۔بقول سخی احمد ہاشمی:

'وہ الفاظ کی تلاش میں سرگرداں نہیں ہوتے۔الفاظ سے تاثر پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ براہ راست احساسات اور تکالیف کا تاثر پیدا کرتے ہیں اور یہی چیز ان کو دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔یا یوں کہا جائے کہ وہ تڑپاتے اور رلاتے نہیں بلکہ بے چینی اور بے قراری کا احساس دلاتے ہیں اور قاری کو اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اس تاثر کو قبول کر کے صرف آہ کر کے رہ جائے،آنسو بہائے یا بے قراری میں تڑپے اور چلا چلا کر روئے۔(۸)

تیرھویں صدی ہجری میں مسلمان اپنی حکومت،دولت،عزت اور علم و ہنر کے لحاظ سے انحطاط پذیر ہو چکے تھے تاہم غالب، سر سید احمد خان،نواب محسن الملک اور حکیم محمود خان جیسے لوگ اس زریں عہد کا ایک بڑا حوالہ تھے۔جب پوری قوم پر جمود اور شکست خوردگی کی کیفیت طاری تھی تو ان اسلاف کی موجودگی،ہندوستان کی مجبور،بے بس اور محکوم قوم کے دلاسے کا باعث تھی۔یہ ماضی کی ایسی کرنیں تھیں جو درخشندہ روایات کی روشنی پھیلاتے ہوئے ایک عالم کو فیضیاب کر رہی تھیں۔حالی **یاد گار غالب** کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

'تیرھویں صدی ہجری میں جبکہ مسلمانوں کا تنزل درجۂ غایت کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت،عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے۔حسن اتفاق سے دارالخلافۂ دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں۔(۹)

حکیم محمود خان انہی با کمال لوگوں میں سے تھے جو مایوسی،بدحالی،بے عملی اور پستی کے اندھیروں میں امیدوں کے چراغ جلا رہے تھے۔انہیں اپنی صلاحیتوں کی بنا پر سعی و عمل پر اکسا رہے تھے۔علم و حکمت کو اپنی گمشدہ میراث سمجھ کر اسے حاصل کرنے پر زور دے رہے تھے۔ان کی شخصیت قوم میں ربط و ضبط پیدا کرتے ہوئے اسے اجتماعی تنظیم میں لانے کا ذریعہ بن رہی تھی۔وہ اخلاقی اصلاح کے داعی اور تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کے پیش نظر،بین الاقوامی اخوت کے قائل تھے۔حکیم محمود خاں ایسے مرد جلیل تھے جن کی امیدیں تو قلیل تھیں لیکن ان کے گریباں میں ایک ہنگامہ رستاخیز تھا۔ان کے افکار حقائق کا مرقع تھے۔تیرھویں صدی،تصویر دور اکبری،علم و دین اور شعر و حکمت میں موجود معنوی اور صوتی نسبتیں نہایت پرلطف ہیں۔اسلوب بیان اور ادائے خیال کی حسن کاری،جادو کا اثر لیے ہوئے ہے۔

اس بزرگی سے گزاری تیرھویں تو نے صدی
پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویر دور اکبری
علم و دین و شعر و حکمت،طب و تاریخ و نجوم
ڈال دی پھر اپنی تو نے چارسو ہر فن میں دھوم

حالی دہلی کو مخاطب کرتے ہوئے اس کے ماضی و حال اور عروج و زوال کو تہ در تہ پیش کرتے ہیں ۔ایمائیت سے حیات و کائنات کا انکشاف کرتے ہیں اور ملت بیضا کے زوال کا احساس ،جب دل کے آبگینوں کو ٹھیس لگا تا ہے تو آبلوں کی طرح پھوٹ بہتے ہیں۔اس بند کا پورا معنیاتی نظام ''اک محمود خاں'' کے گرد گھومتا ہے ۔''اٹھ گئے وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی'' اسی طرح ''ناز اب کس پر کرے گا اے جہاں آباد تو'' کے مصرعے سادگی و پرکاری کا خوبصورت نمونہ ہیں ۔

جاچکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی
ہوچکی تھی آبرومدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی
اٹھ گئے وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی
کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہاں آباد تو

حالی انہیں باد بہار کی خوشبو قرار دیتے ہیں جو اپنے گلشن سے روٹھ گئی۔وہ زندگی کی رونق تھے ۔ان کے جانے سے قوم میں چارسو ایک سناٹا سا نظر آتا ہے کیوں کہ ان کی شخصیت میں دلوں کو تسخیر کرنے کی صلاحیت تھی۔اس بند کا مرکزی خیال ''سلف کی یادگار'' میں مخفی ہے جس کے مٹ جانے پر دل افسردہ ہے ۔

مٹ گئی افسوس اک ایسی سلف کی یادگار
قوم میں جس کی مثال آئندہ کم دیکھیں گے یار
گل کھلائے گی نئے گلشن میں اب بادبہار
رنگ ہوگا جن میں لیکن بو نہ ہوگی زینہار
کرتے ہیں جب ان حوادث کے نظر انجام پر
قوم میں اک ہم کو سناٹا سا آتا ہے نظر

شاعر نے احساس اور جذبے سے معمور غم واندوہ کی ایسی تصویریں کھینچی ہیں کہ وہ منطقی اعتبار سے حقیقت کے قریب نظر آتی ہیں۔لفظوں کا خوبصورت پیرہن اس احساس کو مجسم بنا کے پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے حالی کا مرثیہ عامیانہ جذباتیت سے بڑھ کر ایک مخصوص اور اک کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ وہ دہلی کے واقعات ،سانحات اور اپنی باطنی کیفیات کے باہمی ارتباط سے ایک نئی دنیا کی تخلیق کرنے یا اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ زوال کی سرحد پر کھڑی ہوئی قوم کو ارتقائے حیات کا درس دیا جائے ۔وہ یہاں اپنے ذاتی تخیل کو اجتماعی شعور سے پیوست کر کے اس طرح پیش کررہے ہیں کہ لفظوں کے ابلاغ اور معانی کے امکانات کو توسیع مل سکے۔ یہاں نہ صرف اعلیٰ تخلیقی تجربے کا کمال دکھایا ہے بلکہ مشرقی روایت سازی کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

اس کے استغنا سے جھک جاتا تھا سر مغرور کا
اور عنایت سے کنول جاتا تھا کھل مزدور کا

اس مرثیے پر پروفیسر حمید احمد خاں کی یہ رائے قابل غور ہے۔ جو نہ صرف اس کے پس منظر کو واضح کرتی ہے بلکہ ممدوح کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

یہ بے مثال نظم ایک فرد واحد کا مرثیہ نہیں ،تاریخ انسانی کے ایک عظیم الشان دور اور مسلمانان پاکستان و ہند کے قدیم تمدن کا مرثیہ بھی ہے۔ اس اسلامی تمدن کا مرکز چھ سو برس تک دہلی رہا اس عرصے میں دہلی کے اکابر رجال پورے براعظم کیلئے ہمارے قومی تمدن کے ترجمان تھے اور علم وفن کی قدردانی ارباب کمال کو دور دور سے یہاں کھینچ لاتی تھی۔ 1857ء کے ہنگامے نے بالآخر یہ بساط الٹ دی مگر شہر کی صد ہا برس پرانی تہذیبی روایت ایک دم ختم نہ ہوسکی ۔گزشتہ صدی کے نامور شرفائے شہر اور برگزیدہ اطباء میں حکیم محمود خاں تھے جن کی شخصیت کیا بلحاظ ذاتی شرافت وعظمت کے اور کیا بلحاظ مہارت فن کے ،انتخاب روزگار تھی ۔اس طرح حکیم صاحب کی وفات پر حالی کا نوحہ شہر دہلی کا نوحہ بھی بن گیا ہے اور مسلمانوں کی قومی تہذیب کا نوحہ بھی۔ (۱۰)

حکیم محمود خان کثیر الجہت اور جامع الصفات انسان اور سلف صالحین کی یادگار تھے۔ وہ دہلی کی سماجی زندگی کا اجالا تھے اور ان کے تصور سے رعنائیِ خیال باقی تھی۔ ان کا وجود ہمارے لیے غنیمت تھا۔ان کی موت ایک عالم کی موت ہے۔ایسے صاحبِ کمال کا دنیا سے اٹھ جانا کسی سانحہ سے کم نہیں ۔اب ہم نئی نسل کو یادِ اسلاف کے طور پر کیا چیز دکھائیں گے۔حکیم صاحب کے انتقال پر قوم رنج وغم میں مبتلا ہے ۔حالی قوم کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے ہیں ۔ان کی اکثر تحریریں کلی نہیں تو جزوی طور پر قومی انحطاط کا نوحہ کہی جاسکتی ہیں۔ حالی اپنے قاری کی زیادہ توجہ حاصل کرنے کے لیے اپنے تاثرات میں رنگ آمیزی کرتے محسوس ہوتے ہیں ۔

یہ ابھی پہنچی ہے ہم میں نوبت قحط الرجال
ایک اٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحب کمال
دوسری ملتی نہیں دنیا میں پھر اس کی مثال
ذات باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بیہمال
ظاہر اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

ڈاکٹر سید عبداللہ کا کہنا ہے کہ:

ان کے کلام میں بنیادی معلومات کے ساتھ رنگ آمیزی کی کوشش بھی ہے ۔وہ معلومات کو ہی نہیں ، بلکہ معلومات کے علاوہ کچھ اپنی طرف سے زائد تاثرات پیش کرتے ہیں ۔وہ مماثلتوں کا

احساس دلا کر اپنے بیانات کو زیادہ موثر اور توجہ انگیز بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ (۱۱)

حالی کے ان مرثیوں میں عصری سچائیوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے جس نے زوال پذیر قوم کے ایوانوں میں صور اسرافیل کا کام کیا۔ ان مرثیوں میں جہاں عہد گزشتہ کی بصیرت ہے وہیں آنے والے دور کی گہری معنویت کا احساس بھی جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ حالی ماضی کی درخشندہ روایات مثلاً علم دوستی، علم پروری کا ولولہ انگیز تذکرہ کرتے ہوئے قاری کے دل کو گرما دیتے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے یہ مرثیے قومی نوحے ہیں جو شدید تخلیقی قوت کے شدید تر اثرات کے نتیجے میں لکھے گئے ہیں۔ یہاں ان کا غم، ذاتی غم نہیں رہتا بلکہ قومی غم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ شاعر کے رفتہ رفتہ سلگنے کی کیفیت استعاراتی طور پر ہمہ گیر معانی کی حامل ہے جو فکری تہ داریوں کی گرہ کشائی کرتے ہوئے ذہن اور روح کو سرشار کر دیتی ہے۔ یہ دیکھنے کی نہیں محسوس کرنے کی کیفیت ہے، گویا احساس کی شدت، اثرات کو نمایاں کر دیتی ہے۔ یہ بکھرتے، ٹوٹتے، زوال پذیر ہوتے، مسلم تہذیبی و سماجی ڈھانچے کی ایسی تصویر کشی ہے جو اس دور میں حقیقت تو تھی لیکن قوم اس سے آنکھیں چار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ حالی نے اپنے تخلیقی محرکات سے زوال کے اس تاثر کو پیش کیا ہے جو ہمیں انحطاط کی دلدل سے نکلنے کی ترغیب دیتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ حالی، الطاف حسین، مولانا، **کلیات نثر حالی** (حصہ دوم)، مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۶۸ء ص ۳۱

۲۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، **حالی کی اردو نثر نگاری**، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۴ء، ص ۴۸۸

۳۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، **میر امن سے عبدالحق تک**، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۲، ص ۱۶۵

۴۔ عابد حسین، سید، حالی، مضمون، مشمولہ **مطالعہ حالی**، مرتبہ ساحل احمد، الہ آباد، رائٹرز گلڈ ۱۹۹۷ء، ص ۴۱

۵۔ سرور، آل احمد، حالی کا درجہ ہندوستانی ادب میں، مضمون، مشمولہ **مطالعہ حالی**، مرتبہ ساحل احمد، الہ آباد، رائٹرز گلڈ ۱۹۹۷ء، ص ۷۱

۶۔ ہاشمی، سخی احمد، حالی کے مرثیے، مشمولہ **مطالعہ حالی**، مرتبہ ساحل احمد، الہ آباد، رائٹرز گلڈ ۱۹۹۷ء، ص ۲۷۵

۷۔ صالحہ عابد حسین، **یادگار حالی**، میرپور، آزاد کشمیر، ارسلان بکس، س ن، ص ۱۹۷

۸۔ ہاشمی، سخی احمد، حالی کے مرثیے، مشمولہ **مطالعہ حالی**، مرتبہ ساحل احمد، الہ آباد، رائٹرز گلڈ ۱۹۹۷ء، ص ۲۵۵

۹۔ حالی، الطاف حسین، **یادگار غالب**، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن، ص ۷

۱۰۔ حمید احمد خان، پروفیسر، **ارمغان حالی**، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲۰۱۰ء، ص ۲۳۹

۱۱۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، **سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ**، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء، ص ۱۱۵

○○○